© rasailojaraid.com

مسلم معاشروں میں بھی نافذ کیا جاسکتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اصولوں پر یقین رکھنے والی ایک جماعت وجود میں آئے جس کی اخلاقی قوت (moral Force) اس کا اصل سرمایہ ہو۔ یہ جماعت چاہے تعداد میں محدود ہو اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے ایک انقلابی کردار ادا کر سکتی ہے اور امن وعدل سے محروم انسانیت کو نیا حوصلہ اور عزم دے کر ایک روشن مستقبل کی تعمیر میں کامیاب ہوسکتی ہے۔

........................حواشی........................

۱: ایسی دوسری تازہ کاوشوں میں جن کے ذریعے اسلام اور مسلمانوں کی مسخ شدہ شبیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، بروس لنکن کی کتاب

"Holy Terror : Thinking About Relogion after September11"

اور برنارڈ- ہنری لیوی کی کتاب "Who Killed Danel Pearl?" شامل ہیں۔

۲: القرآن ۴:۷۵

۳: القرآن ۲۲:۴۰

۴: القرآن ۱۰:۲۵

۵: القرآن ۵:۳۲

۶: القرآن ۴:۲۹ اور ۲:۱۸۸

۷: القرآن ۱۷:۳۵

۸: القرآن ۲۴:۳۲

۹: القرآن ۲:۲۵۶

۱۰: القرآن ۵:۸

۱۱: القرآن ۱۰۹:۱-۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالمی امن وانصاف: مسیحی تناظر

ایان مارکھیم

امن اور انصاف کے حوالے سے مسیحیت کا نقطہ نظر وسیع طور پر دو موقفوں میں منقسم ہے۔ان میں سے ایک امن اور انصاف کو لازم وملزوم قرار دیتا اور امن پسندی کی گواہی کو انصاف کی گواہی کے جزو کی حیثیت سے ضروری ٹھہراتا ہے۔اس موقف کی بنیاد یسوع کے دور میں رکھی گئی اور ابتدائی تین سو برسوں میں چرچ کی تشکیل اسی کے مطابق ہوئی۔دوسرا موقف یہ ہے کہ امن اور انصاف کے تحفظ کی خاطر بعض اوقات لڑنا ضروری ہوجاتا ہے۔یہ موقف رومن شہنشاہ کانسٹن ٹائن کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد ۳۴۰ عیسوی کے لگ بھگ ظہور میں آیا۔اب میں دونوں موقفوں کا مزید تفصیل کے ساتھ تجزیہ کروں گا۔

پہلا موقف: امن اور انصاف لازم وملزوم ہیں، امن پسندی کی گواہی، ہماری انصاف کی گواہی کا حصہ ہے

نئے عہدنامے کے بیشتر اسکالر اس پر متفق ہیں کہ یسوع نے امن پسندی سکھائی بھی اور اسی کے مطابق زندگی بھی گزاری۔اس حقیقت کے باوجود کہ وہ ان لوگوں کے درمیان تعلیم دے رہے تھے جن پر ایک فوجی آمر نے اپنا تسلط قائم کر رکھا تھا، ان میں سے بہت سے بالفعل پرتشدد انقلاب کے حامی تھے،لیکن یسوع نے عدم تشدد پر مبنی زندگی کی دعوت دی۔یسوع کی یہ وضاحت مشہور ہے کہ:

''تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔''[1]

اس میں نکتہ یہ ہے کہ آپ کو اس قانونی اصول کے حوالے سے اپنا حق استعمال نہیں کرنا چاہیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ سزا عین جرم کے مطابق ہو (ایک آنکھ کے بدلے ایک آنکھ)۔ تشدد کو ہوا دینے کے بجائے آپ کو اس میں کمی لانی چاہیے۔ تشدد کے چکر کو، جو انتقام کی آگ بھڑکاتا ہے اور جس کے نتیجے میں مزید تشدد جنم لیتا ہے، توڑنے کا سادہ طریقہ تشدد کو قبول کر لینا ہے۔

جوابی کارروائی کے بجائے، یسوع ہمیں ہر ایک کو معاف کر دینے کی تلقین کرتے ہیں۔ معاف کر دینے کا عمل، دوسرے شخص کی جانب سے ماضی میں کی گئی غلطی پر توبہ کو قبول کر لینے اور اس طرح اس غلطی کو ماضی ہی میں چھوڑ دینے کا نام ہے۔ حواری پطرس نے یسوع سے پوچھا کہ کیا معاف کر دینے کی کوئی عددی حد ہے، اس کے جواب میں یسوع نے کہا کہ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ ماضی کی غلطی کے ازالے کے لیے بدلے کے اہتمام کے بجائے معافی وہ نظام ہے جو ماضی کے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ مسیحی مذہبی تعلیمات میں یہ بات اہم ہے کہ یسوع کی زندگی صلیب پر ختم ہوئی۔ یہ واقعہ بدلہ نہ لینے کے اصول ہی کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مصلوب کیے جانے کے تین دن بعد وہ دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں آئے اور جنت میں جانے سے پہلے چالیس روز زمین پر رہے۔ یہ اس زندگی کا ایک ثبوت ہے جو خدا پر بھروسہ رکھنے والے بسر کرتے ہیں۔ اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ امن پسندی بدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کا نام نہیں ہے، انسان کو تشدد کے سوا وہ تمام وسائل جو اس کی دسترس میں ہوں، ظلم و بے انصافی کے خاتمے اور دنیا کو بدلنے کے لیے استعمال کرنے چاہئیں۔ مزید یہ کہ عدم تشدد اور بدلہ نہ لینے کا یہ طریقہ، خدا پر ایمان کا مظہر ہے جو بالآخر حق اور انصاف کو غالب کرے گا۔

بیسویں صدی میں امن پسندی پر مبنی ردعمل کی دو خصوصی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ دونوں مثالیں امن اور انصاف، دونوں سے وابستہ ہیں۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی (۱۸۶۹-۱۹۴۸) نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی قوم پرست تحریک کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تشدد اور دہشت گردی کے طریقے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس کے بجائے قابض طاقت (برطانیہ) کو سول نافرمانی کی تحریک کے ذریعے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیسویں صدی کے دوسرے مشہور امن پسندی کے علمبردار شخص مارٹن لوتھر کنگ جونیئر (۱۹۶۸-۱۹۲۹) تھے۔ کنگ نے امریکا میں شہری حقوق کی تحریک کی قیادت کی۔ وہ عدم تشدد سے اپنے تعلق کی وضاحت خدا کی شبیہ کے مسیحی عقیدے سے اپنی وابستگی کے لازمی نتیجے کے طور پر کرتے ہیں:

''اب مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اگر ہم زمین پر امن اور انسانوں کی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمیں جس دوسری چیز کی فکر کرنی چاہیے وہ عدم تشدد اور تمام انسانوں کی زندگیوں کے تقدس کو تسلیم کرنا ہے۔ ہر انسان قابل لحاظ ہے کیونکہ وہ خدا کی اولاد ہے۔ لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ ''تمھیں قتل نہیں کرنا چاہیے،''[۲] تو درحقیقت ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ انسانی زندگی اتنی مقدس ہے کہ اسے دنیا کے جنگ کے میدانوں میں نہیں لے جایا جانا چاہیے۔ انسان چکر کھاتے برقیوں کی بے وقعت حرکت یا سلگتی لکڑی کے کسی لامحدود ڈھیر سے اٹھتے دھوئیں کے ایک مرغولے سے زیادہ بلند حیثیت رکھتا ہے۔ انسان خدا کی اولاد ہے اور اس کی شکل پر تخلیق کیا گیا ہے، چنانچہ اس کا اسی طرح احترام کیا جانا چاہیے۔ جب تک انسان اور قومیں ہر جگہ اس کا اہتمام نہیں کریں گی، ہم جنگیں لڑتے رہیں گے۔ ایک نہ ایک دن کسی کو ہمیں یہ یاد دلانا ہوگا کہ اگرچہ ہمارے درمیان سیاسی اور نظریاتی اختلافات ہو سکتے ہیں، اس کے باوجود ویت نامی ہمارے بھائی ہیں، روسی ہمارے بھائی ہیں، چینی ہمارے بھائی ہیں، اور ایک دن ہم سب کو بھائی چارے کی میز پر مل بیٹھنا ہے۔''[۳]

ساری اشتعال انگیزی کے باوجود، مارٹن لوتھر کنگ اس پر جمے رہے کہ سماجی تبدیلی کا طریق کار عدم تشدد پر مبنی ہونا چاہیے۔ چنانچہ بس بائیکاٹ، جس کا آغاز روس پارکس نے کیا، اور ووٹر رجسٹریشن کی مہم سمیت ہر حکمت عملی عدم تشدد پر مبنی تھی۔ ان دونوں معاملات میں گاندھی اور کنگ یقین رکھتے تھے کہ سماجی تبدیلی کے لیے ان کے پیغام کی کامیابی تشدد سے گریز پر منحصر ہے۔

امن پسندی کے حق میں چار دلائل موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ مسلمہ اصول ہے کہ قتل کرنا غلط ہے۔ کسی مقصد کے لیے جان لینا اس مقصد کو آگے نہیں بڑھاتا۔

اسی نقطہ آغاز سے باقی تین نکات نکلتے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ تشدد کا جواب تشدد سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینے کے حق کا استعمال اکثر حالات کو زیادہ خراب کر دیتا ہے۔ پیچیدہ مسائل کے فوجی حل بہت کم ہی کارگر ہوتے ہیں۔ برطانیہ کی جانب سے شمالی آئرلینڈ میں آئی آر اے کے دہشت گرد حملوں کا فوجی حل تلاش کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ اسی طرح حماس کے خلاف اسرائیلی حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس میں بھی کوئی بھلائی نظر نہیں آتی۔ بعض اوقات کچھ دیر کے لیے ایسا لگتا ہے کہ فوجی حل کامیاب ہو گیا ہے مگر محض چند عشروں کے بعد پرانا مسئلہ نئے روپ میں واپس آ جاتا ہے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد اتحادیوں نے سمجھا تھا کہ معاہدہ ورسیلز (۱۹۱۹ء) جرمنی کے مسئلے کا حل ہے، لیکن ۱۹۳۳ء میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ ایڈولف ہٹلر کی مقبولیت کا کلیدی عامل، اس معاہدے کا غیر مقبول ہونا تھا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ تشدد کے راستے کا انتخاب باقی سب پر توہین آمیز اثرات مرتب کرتا ہے۔ گاندھی نے اس کی بخوبی وضاحت یوں کی ہے:

''اس بات پر میرا غیر متزلزل اعتقاد ہے کہ کسی مقصد کو تشدد سے ٹھیک اتنا ہی نقصان پہنچتا ہے جس قدر اس کے لیے تشدد کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس بات کو میں مختلف انداز میں یوں کہتا ہوں۔ اگر میں ایک ایسے شخص کو قتل کر دوں جو میرے راستے میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو مجھے تحفظ کا ایک غلط احساس ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تحفظ بہت کم وقت باقی رہے گا۔ کیونکہ میں نے مسئلے کو جڑ سے حل نہیں کیا۔ کچھ عرصے کے بعد کوئی دوسرا شخص میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ اس لیے میرا کام یہ نہیں ہے کہ میں ان لوگوں کو قتل کرتا رہوں جو مجھے روکیں، بلکہ یہ ہے کہ میں اس وجہ کو دریافت کروں اور اسے دور کروں جو ان لوگوں کو میرے راستے میں رکاوٹ ڈالنے پر آمادہ کرتی ہے۔ میں مسلح شورشوں پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ علاج اس بیماری سے بدتر ہے جس سے شفا مقصود ہے۔ یہ شورشیں انتقام، بے صبری اور غصے کی علامت ہیں۔ تشدد کا طریقہ زیادہ دیر تک کارگر نہیں رہ سکتا۔''[۴]

یہ اقتباس امن پسندی کے حق میں چوتھی دلیل تک لے جاتا ہے۔ مسائل کو تہہ میں موجود بنیادی سبب تک حل کرنا ضروری ہے جبکہ تشدد کے نتیجے میں اصل تنازع یا اختلاف پیچھے چلا جاتا ہے۔ چنانچہ انتہا پسند اکثر تشدد کے راستے کا انتخاب کسی پوشیدہ احساس عدم تحفظ کی بناء پر کرتے ہیں۔ گوروں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالادستی کے علمبردار جو کالوں کو بے قصور نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں، یا ہم جنس پرستوں سے خائف لوگ جو ہم جنس پرستوں کو اذیت دینا چاہتے ہیں، دراصل نفرت یا ناپسندیدگی کے باعث دوسروں پر کوڑے برسا کر اپنے تہذیبی اور ذاتی احساس عدم تحفظ کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ اس تشدد کا مقابلہ تشدد سے کرنے کا نتیجہ عدم تحفظ کو مزید بڑھانے ہی کی شکل میں نکل سکتا ہے۔ لیکن تشدد کا مقابلہ محبت سے کیا جائے تو اس نقصان کی تلافی کی راہ ہموار ہو سکتی ہے جو عدم تحفظ کے احساس کے نتیجے میں واقع ہوا تھا۔

امن پسندی ایک بصیرت ہے۔ یہ زندگی کا عملی راستہ ہے۔ اس کے نزدیک محبت دل جیت سکتی ہے اور اس کے ذریعے برے لوگ بالآخر تبدیل کیے جا سکتے اور تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تاہم کیا کوئی گاندھی یا مارٹن لوتھر کنگ، جرمنی میں ہٹلر کو شکست دے سکتا تھا؟ یہ بات پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے عیسائی کہتے ہیں کہ بعض مواقع پر قتال کا راستہ منتخب کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ فطری طور پر یہاں بھی قواعد وضوابط ہونے چاہئیں۔ جب دو قومیں لڑتی ہیں تو فوجیں نتیجے کا تعین کرتی ہیں۔ بچوں (یا مزید وسیع طور پر: غیر برسر جنگ شہریوں) کا قتل جنگ کے نتیجے میں قطعی معاون نہیں ہوتا۔ یہ اصول اب بین الاقوامی قانون کا حصہ اور جنگ کے جائز قوانین کی حیثیت سے اقوام عالم کی وسیع اکثریت کی جانب سے تسلیم شدہ ہیں۔ یہ قوانین دوسرے موقف سے متعلق ہیں جس کا اب ہم جائزہ لیں گے۔

دوسرا موقف: انصاف اور امن کی خاطر بعض اوقات لڑنا ضروری ہو جاتا ہے

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یسوع نے امن پسندی کے ساتھ زندگی گزاری اور اسی حیثیت سے موت قبول کی۔ اگرچہ رومی فلسطین پر قابض تھے مگر یسوع نے شعوری طور پر تشدد کے طریقے کو مسترد کیا۔ جب یسوع کو گتسمنی سے گرفتار کیا گیا تو متی کے بقول ان کے ایک حواری نے تلوار سے ان کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ متی لکھتے ہیں:

''اور دیکھو، یسوع کے ساتھیوں میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر اپنی تلوار کھینچی اور سردار کاہن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے نوکر پر چلا کر اس کا کان اڑا دیا۔ یسوع نے اس سے کہا اپنی تلوار کو میان میں کر لے کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کیے جائیں گے۔ کیا تو نہیں سمجھتا کہ میں اپنے باپ سے منت کر سکتا ہوں اور وہ فرشتوں کے بارہ تمن سے زیادہ ابھی موجود کر دے گا، مگر وہ نوشتے کہ یوں ہی ہونا ضرور ہے کیونکر پورے ہوں گے؟''

مؤرخین متفق ہیں کہ یسوع نے نہ صرف یہ کہ امن پسندی کی تعلیم دی بلکہ وہ اپنے امن پسندانہ اصولوں کی خاطر جان دینے کے بھی خواہش مند تھے۔ امن پسندی کے شعوری اقرار نے ابتدائی چرچ کی صورت گری میں اس کے وجود کے پہلے تین سو برسوں کے دوران مسلسل اہم کردار ادا کیا۔ رومن شہنشاہ کانسٹن ٹائن کے مذہب تبدیل کرنے تک (۳۴۰ عیسوی) مسیحیت نے جنگ کو جائز قرار دینے کے راستوں کی تلاش شروع نہیں کی۔ یہ ہپو کا اسقف سینٹ آگسٹائن (۳۴۵-۴۳۰) تھا جس نے جائز جنگ کی روایت کے بیج بوئے۔ اس کا فوری مسئلہ ۴۱۰ عیسوی میں ابھرا جب رومیوں کو ویزی گوتھس اور پڑوسی قبائل کے ہاتھوں شکست کا سامنا تھا۔ سلطنت کے غیر محفوظ ہونے کی یہ کیفیت ایک حد تک عیسائیوں کی جانب سے سلطنت کے دفاع میں تذبذب کے باعث تھی۔ آگسٹائن نے عبرانی بائبل میں جنگ کے لیے کافی جواز پا لیا۔ (دیکھیے، خروج ۱۵:۱-۱۸، استثنا ۲۰:۱۰-۱۸، یشوع ۶-۷)۔ چونکہ خدا جنگ کی کمان کرنا چاہتا تھا اور چونکہ خدا قوموں کے حکمراں مقرر کرنے کا ذمہ دار ہے، لہٰذا یقینی طور پر بعض حالات میں جنگ جائز قرار دی جا سکتی ہے۔

آگسٹائن نے دو شرائط تجویز کیں۔ ایک یہ کہ جنگ کسی جائز مقتدرہ کی جانب سے منظور کی جانی چاہیے۔ نگہبانوں کی جانب سے کی گئی اقدامی کارروائی کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہو سکتی۔ افراد کا قانون کا اپنے ہاتھوں میں لے لینا اکثر حالات میں تشدد کے سلسلے کے آغاز کا سبب بن سکتا ہے۔ قتل و غارت کا عمل انتقام کے جذبے کو جنم دیتا ہے۔ اس کے عقیدے کی رو سے خدا کے قوموں کے حکمرانوں کے تقرر کا ذمہ دار ہونے کے سبب جائز اتھارٹی، خدا کا مقرر کردہ حکمراں تھا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جنگ کسی منصفانہ مقصد کے لیے ہونی چاہیے۔ اس میں اپنا دفاع یا دوسروں کا تحفظ شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی حکمراں کے توسیع پسندانہ عزائم اس میں شامل نہیں کیے جاسکتے۔

تیرھویں صدی میں عظیم ڈومین مبلغ سینٹ تھامس اکیوناس نے ایک تیسری شرط کا اضافہ کیا، اور وہ یہ کہ نیت درست ہونی چاہیے۔ آپ کا ارادہ لازماً بھلائی کے فروغ کا ہونا چاہیے، برائی کے پھیلاؤ کا نہیں۔ ایک مفہوم میں یہ شرط، دوسری شرط کی وضاحت کرتی ہے، یعنی مقصد لازماً منصفانہ ہونا چاہیے۔ اکیوناس کی وضاحت سے ہمیں یہ بصیرت حاصل ہوتی ہے کہ جنگ لڑنے کا مقصد منصفانہ امن کا قیام ہونا چاہیے۔ اکیوناس مانتا تھا کہ بعض اوقات ظالم حکمراں کے خلاف جنگ کے ذریعے ہی منصفانہ امن حاصل ہوسکتا ہے۔ اس طرح جو تصویر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر ہم جنگ کا راستہ منتخب کرنے میں درست ہوتے ہیں بشرطیکہ صرف اور صرف یہی امن تک پہنچنے کا واحد ممکن راستہ ہو۔

منصفانہ جنگ کی روایت پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی رہی۔ سولہویں صدی میں اسپین کے ویٹوریا اور سوارز بین الاقوامی قانون کی روایت کو ترقی دینے اور اس موضوع پر کھلی بات چیت شروع کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ فرانسسکو ڈی ویٹوریا (۱۴۹۲-۱۵۴۶) کو عالمی سطح پر جدید بین الاقوامی قانون کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ڈومینی تھا اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا بیشتر حصہ اس نے سالا مانکا یونیورسٹی میں پڑھانے میں گزارا۔ ویٹوریا کی موت کے دو سال بعد فرانسسکو سوارز (۱۵۴۸-۱۶۱۷) پیدا ہوا۔ مذہب (خصوصاً کلیسا کے کردار) اور اخلاقیات (خصوصاً سیاسیات) پر اس کی وسیع الاطراف تحریروں نے اسے انتہائی ممتاز مقام عطا کیا۔ وٹوریا اور سوارز کے درمیان منصفانہ جنگ کی روایت میں تین مزید شرائط شامل کی گئیں۔

ان میں سے پہلی یہ تھی کہ ظلم و بے انصافی کے خاتمے کے دوسرے تمام طریقے ناکام ہو چکے ہوں اور جنگ فی الحقیقت آخری راستہ ہو۔ جس غلط روی کا ارتکاب کیا گیا، اس کی اصلاح کے تمام پر امن ذرائع کو جنگ سے پہلے لازمی طور پر آزمایا جاچکا ہو۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جنگ کے جیتے جانے کی معقول وجوہ کی بناء پر امید ہونی چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ شرط ہے جو بتاتی ہے کہ اگر ہار یقینی نظر آتی ہو تو کسی حکمراں کے لیے اپنی قوم کو دلیرانہ جنگ میں مبتلا کر دینا غلط ہے اگرچہ اس کا مقصد جائز اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

منصفانہ ہو۔ ناکام جائز جنگوں کو اس شرط کی رو سے سراہا نہیں جاسکتا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر ممکنہ جانی نقصان کا المیہ تقاضا کرتا ہے کہ عملی اقدام سے پہلے اسے ترازو میں اچھی طرح تول لیا جائے۔ تیسری شرط یہ تھی کہ جنگ کا طریقہ لازماً جائز اور قانونی ہونا چاہیے۔

ان شرائط میں یہ سوچ کارفرما ہے کہ غیر ضروری قتل و غارت گری ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔ جانی نقصان اور مصائب کو، منصفانہ امن کے قیام لیے، لازماً کم سے کم ناگزیر حد کے اندر رکھا جانا چاہیے۔ چنانچہ مثال کے طور پر وٹوریا کا خیال تھا کہ مفتوح ہو جانے والوں سے ان کے ہتھیار لے لینا تو درست ہے لیکن ان کی زرعی فصلوں کو برباد کر دینا غلط ہے۔ کئی حالیہ جنگوں (مثلاً بوسنیا۔ ہرزے گووینا کی جنگ) میں جیتنے والے، مفتوحین کے گھروں کو جلانے اور آبروریزی کے واقعات میں ملوث ہوئے جس کے نتیجے میں تارکین وطن کا سنگین مسئلہ پیدا ہوا، وٹوریا اس حوالے سے ایک اخلاقی نقطہ نظر رکھتا تھا جسے دنیا کو آج بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔

اکیسویں صدی میں ہمارے داخلے کے بعد بھی منصفانہ جنگ کی روایت ہمیشہ کی طرح برمحل ہے۔ منصفانہ جنگ کی روایت کے اب تک کے سفر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم اب جنگ لڑنے کے حق کے لیے درست شرائط اور اس اخلاقی رویے کے درمیان فرق کرتے ہیں جو کبھی ماضی میں جنگوں میں اپنایا جاتا تھا۔ تقریباً ہر وہ شخص جو محسوس کرتا ہے کہ جنگ بعض اوقات جائز اور درست ہوتی ہے، وہ منصفانہ جنگ کی روایت کو اہم قرار دے گا۔ جدید ہم عصر دلائل تین منطقوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلا یہ کہ کیا 'منصفانہ انقلاب' برپا کرنا ممکن ہے؟ دوسرے یہ کہ کیا کوئی فریق جدید جنگ میں کبھی جوہری ہتھیار استعمال کرسکتا ہے؟ اور اگر اخلاقی طور پر کوئی فریق انہیں استعمال نہیں کرسکتا تو پھر یہ ہتھیار کس مفہوم میں مانع جنگ ہیں؟ اور تیسرے یہ کہ ایسی دنیا کے اندر جس میں سب سے بڑا خوف یہ ہے کہ کوئی دہشت گرد گروہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں تک پہنچ سکتا ہے، کیا ہم منصفانہ جنگ کی روایت میں پیشگی حملے کی اجازت دینے کے لیے تبدیلی کرسکتے ہیں؟ آیئے اب ہم ان تینوں موضوعات کو، منصفانہ جنگ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنگ لڑنے کی شرائط حسب ذیل ہیں:

۱) **جائز مقتدرہ کی ضرورت:** اگرچہ بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک ظالم حکمراں کے خلاف 'منصفانہ انقلاب' کا راستہ اختیار کیا جانا چاہیے، تاہم منصفانہ جنگ کی روایت اس فیصلے کو حکومت کی جائز مقتدرہ تک محدود کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ نجی طور پر افراد اور گروہوں کی صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ پرتشدد اقدام بآسانی گروہی جنگ اور جرائم کے خاتمے کے لیے ماورائے حکومت طریقے کی شکل میں ڈھل سکتا ہے۔ اسی سے یہ بات بھی منسلک ہے کہ کسی قوم کی قیادت ہی اس فیصلے کی اہل ہوتی ہے کہ کسی جائز مقصد کے لیے ہتھیار کب اٹھانے چاہئیں۔ قائد بڑی تصویر دیکھنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے چنانچہ وہ سب سے بہتر طور پر یہ طے کرنے کا اہل ہوتا ہے کہ جنگ کا اعلان کب ضروری ہے۔

۲) **مقصد لازماً درست ہونا چاہیے:** اس شرط پر عمل میں افراد کی یادداشت کی حد مشکل پیدا کرتی ہے۔ منصفانہ جنگ کی روایت کا تقاضا ہے کہ جنگ کو صرف اپنے دفاع، کسی اور قوم کے دفاع، معصوموں کے تحفظ یا ناجائز طور پر ہتھیائے گئے اموال اور زمینوں کے واپس لینے تک محدود رکھا جائے۔ لیکن بہت سی جنگیں (مثلاً سربیا اور کروشیا کی جنگیں) پیچیدہ تاریخی بنیادیں رکھتی ہیں۔ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ ''کیا ایک جائز مقصد کو پیشگی جنگ تک وسعت دی جاسکتی ہے؟'' عام اصول کی رو سے روایت تقاضا کرتی ہے کہ غلط روی یا جرم کا ارتکاب کیا جاچکا ہو۔ جبکہ کسی جرم کے ارتکاب کے بارے میں پہلے سے اندازہ لگالینے میں مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص کبھی یقینی طور پر طے نہیں کرسکتا کہ جرم کا ارتکاب کرلیا جائے گا، اس لیے ایسی صورت میں بے انصافی اور ظلم کے راستے پر جاپڑنا آسان ہے۔

۳) **مقصد کا درست ہونا:** جنگ لازمی طور پر منصفانہ امن کے قیام کے مقصد کے ساتھ لڑی جانی چاہیے۔

۴) **جنگ کو آخری راستہ ہونا چاہیے:** جنگ چھیڑنا ہمیشہ ایک سنجیدہ معاملہ ہوتا ہے۔ جنگ میں ہلاکتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ فی الحقیقت یہی آج جنگ کی 'سائنس' ہے۔ اب مرنے والوں کی تعداد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(جس میں لڑنے والے اور نہ لڑنے والے دونوں شامل ہیں) کا پیشگی اندازہ لگانا ممکن ہے۔ لہٰذا، جنگ کی سنگینی کی بناء پر، حکومت کو امن اور انصاف کے قیام کے لیے تمام دوسرے سفارتی اور غیر فوجی ذرائع کو لازماً پہلے آخری حد تک آزما لینا چاہیے۔ پیشگی حملے کی حمایت کرنے والوں کے لیے یہ ایک کلیدی مشکل ہے: اس کا مطلب ناگزیر طور پر یہ ہے کہ جنگ کا انتخاب دوسرے تمام متبادل راستوں کے ختم ہو جانے سے پہلے کیا گیا۔

۵) **کامیابی کا معقول امکان**: ہم ایک دلچسپ تاریخی لمحے میں جی رہے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ واحد سپر پاور ہونے کی بناء پر امریکا کی حکومت اس شرط پر ہمیشہ پورا اترے گی۔ اپنی وسیع فوجی طاقت کے ذریعے، امریکی حکومت جنگ کے آغاز کے بعد چند ماہ کے اندر ہی نتیجہ حاصل کر سکتی ہے۔ تاہم یہاں ابہام یہ ہے کہ کیا کامیابی کی تعریف اتنی ہی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد امن قائم کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔

۶) **تناسب فوجی طریقے کا ایک اہم پہلو ہے**: جب ارجنٹائنا کی حکومت نے برطانیہ کے زیر حکومت فاک لینڈ پر حملہ کیا (۱۹۸۲)، اس وقت برطانوی حکومت کی جانب سے ارجنٹائنا کے بڑے شہروں کے خلاف جوہری ہتھیاروں کا استعمال منصفانہ جنگ کی اس شرط کی خلاف ورزی ہوتا۔ بے انصافی کے خلاف جوابی کارروائی کو اس سے زیادہ بے انصافی کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ یہ شرط جوہری ہتھیاروں کے استعمال اور پیشگی جنگ کے نظریے، دونوں کے لیے سنگین مشکلات سامنے لاتی ہے۔ یہ شرائط جنگ کے طریق کار پر منطبق ہوتی ہیں۔

۷) **غیر برسر جنگ افراد کو ہدف بنانا غلط ہے**: جنگ کے بڑے متاثرین میں اکثر عمر رسیدہ افراد، عورتیں اور بچے شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جنگ کے نتائج کا تعین کرنے کی حیثیت میں نہیں ہوتے۔ اس لیے کسی غیر برسر جنگ شخص کا مرنا یا زخمی ہونا غلط ہے۔ جوہری ہتھیاروں کے معاملے میں یہ بھی ایک کلیدی مشکل ہے۔ لیکن یہ بات اہم اور قابل توجہ ہے کہ ہتھیاروں کی تازہ ترین نسل بہت مؤثر طور پر اصل ہدف کو نشانہ بنانے کے لائق ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ منصفانہ جنگ کی روایت تسلیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتی ہے کہ دوطرفہ نقصان ہوگا (یعنی ایسا وقت آسکتا ہے جب افسوسناک طور پر کوئی غیر برسر جنگ فرد نشانہ بن جائے)۔

۸) **متناسب ذرائع کا استعمال ضروری ہے:** جنگ چھیڑنے والے کے لیے تناسب جنگ سے پہلے بھی اور جنگ کے دوران بھی ایک قابل لحاظ معاملہ ہے۔ جوہری ہتھیار کا استعمال تقریباً ہمیشہ مسائل پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ کیا ہیروشیما کی تباہی (ناگاساکی کو الگ رہنے دیں) اس شرط کو پورا کرتی تھی، اب تک ان انتہائی متنازع موضوعات میں سے ایک ہے جنہوں نے دوسری عالمی جنگ کے طریق کار کے معاملے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ جو لوگ اسے درست سمجھتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ ان دو بموں نے جاپانیوں کو اتحادیوں کے سامنے متوقع مدت سے پہلے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا جبکہ جو لوگ اسے ناجائز سمجھتے ہیں وہ ان کارروائیوں میں لاکھوں غیر برسر جنگ افراد کی ہلاکتوں کو، اپنے موقف کی بنیاد بناتے ہیں۔

عالمی امن وانصاف کے مفاہیم و مضمرات: مسیحی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جنگ اور تشدد کا راستہ اپنانے سے پہلے تمام پرامن ذرائع آخری حد تک آزما لیے جانے چاہئیں۔ حتیٰ کہ جائز اور منصفانہ جنگ کی روایت میں بھی، طاقت کا استعمال آخری متبادل اور خصوصی طور پر منصفانہ امن کے قیام کا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔

اس کے نتیجے میں فطری طور پر سوال ابھرتا ہے کہ عیسائیوں کے نقطہ نظر کی رو سے منصفانہ معاشرہ کیا ہے؟ اس کے بنیادی اجزاء حسب ذیل ہیں:

پہلا یہ کہ اس معاشرے میں تمام انسانوں کے بنیادی حقوق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ انسانی حقوق کی بنیادیں روشن خیالی کے بعد کی فکر میں پائی جاتی ہیں۔ جان لاک (۱۶۳۲-۱۷۰۴) اس حوالے سے ایک کلیدی شخص اور انقلاب فرانس ایک کلیدی واقعہ ہے۔ تاہم روشن خیالی کے تصور کی تشکیل کے پورے معاملے میں مسیحی اور مذہبی بنیادوں کا گہرا عمل دخل نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ عقیدہ کہ تمام انسان خدا کی شکل پر پیدا کیے گئے ہیں، اس نظریے کا کلیدی خیال ہے۔[۶] فی الحقیقت میں سمجھتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں کہ مذہبی بنیادوں کے بغیر اس نظریے کا باقی رہنا مشکل ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک منصفانہ معاشرے کو لازمی طور پر مواقع میں برابری مہیا کرنی چاہیے۔ تمام انسانوں کا اخلاقی مرتبہ یکساں ہے۔ لہٰذا مواقع تک سب کی دسترس بھی مساوی ہونی چاہیے۔ دنیا کی ترقی میں سب سے بڑا چیلنج سب کی شمولیت ہے۔ غریبوں اور کنارے لگے لوگوں کو، جن کے مواقع تعلیم کی کمی یا سماجی امداد کے نظام کی خامیوں کی وجہ سے محدود ہیں، نظر انداز کر دینا بہت آسان ہے۔ ترقی کے عمل میں ان سب کی شمولیت کو یقینی بنانا ایک منصفانہ معاشرے کی ذمہ داری ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک منصفانہ معاشرے کو لازمی طور پر قانون اور نظم وضبط کے ایک مضبوط ڈھانچے کا حامل ہونا چاہیے۔ کسی بھی منصفانہ اور صحت مند معاشرے کے لیے یہ ایک بنیادی شرط ہے۔ چوری اور حملوں کے خوف سے آزاد رہتے ہوئے جینا لوگوں کا حق ہے۔

چوتھے یہ کہ منصفانہ امداد، فلاحی تعاون کی ایک مؤثر رینج فراہم کرتی ہے۔ معاشرے میں لوگوں کو زندگی کے لیے لازماً جدوجہد کرنی ہوتی ہے۔ ایک منصفانہ معاشرے میں ایسی گنجائشیں رکھی جانی چاہئیں جو ان کے لیے اچھی زندگی کو یقینی بنائیں۔

ایک منصفانہ معاشرے کی تخلیق عیسائیوں پر خدا کی طرف سے، یسوع مسیح کو دی گئی ہدایات کے مطابق، عائد کردہ ذمہ داری ہے۔ لہٰذا تمام عیسائیوں کے لیے اصل چیلنج معاشرے کو زیادہ قریب لانے میں اپنا کردار ادا کرنا ہے کہ خدا تمام انسانوں کے ساتھ تعمیری تعلق کا دائمی حق دار ہے۔

[عیسائیوں کی جانب سے یہ کردار ادا نہ کرنے کا] نتیجہ پیداوار و صرف کا انتہائی متحرک اور انتہائی استحصالی نظام ہے جس کا دنیا نے اس سے پہلے کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔ بالا دست ملک کی استعماری دسترس تمام حدود سے بالاتر ہے۔

© rasailojaraid.com